میرا باپ دیوانہ ہو چکا تھا۔۔۔۔اس کی آنکھوں میں کلر نے چھڑکاؤ کر رکھا تھا۔

''ابا یہاں اکیلا مت رہ ناں۔۔۔۔وہاں ہم دونوں ہیں تیری خدمت کریں گے۔۔۔۔چل ناں۔''

وہ ہنسنے لگا۔ایک تنہا بڈھے کی مجروح ہنسی۔

''اور اس کی قبر کو کلر کے حوالے کر دوں؟۔۔۔۔یہاں تو روز قبر دیکھنے نہ جاؤں تو چوتھے دن قبر کا منہ پھٹ جاتا ہے۔''

''ابا۔۔۔۔یہاں بڑی مشکل ہے وہاں۔''

ابا نے حویلی پر نظر دوڑائی اور بولا۔۔۔۔''یہاں وہاں کچھ نہیں بیٹے۔۔۔۔مجھے جسم کا ارام نہیں چاہیئے۔۔۔۔یہاں میری روح خوش ہے وہ اسی گھر میں آئی تھی۔ یہیں سے اس کا جنازہ نکلا۔۔۔اوئے احمق مجھے مرد ہو کر اتنی توفیق نہیں کہ میں اس کے مرنے کے بعد اس کے گھر خیال رکھوں؟۔۔۔اس نے تو ساری عمر میرے گھر کی اینٹ اینٹ سے پیار کیا۔''

میں ساری دوپہر ابا کے پاس چپ بیٹھا رہا دھوپ ڈھلنے کے وقت میں نے سوٹ کیس اٹھایا اور سٹیشن کی طرف چلنے لگا۔

آخری بار اس جگی کھڑے ہو کر میں نے اندر نظر ڈالی جہاں جوانی میں ابا کا مونڈھا ہوتا تھا

سارا صحن خالی تھا

تین طرف بنے ہوئے کمروں کے کچھ دروازے کھلے کچھ بند تھے۔لیکن سب کا پلستر کلر کی ہوا چاٹ گئی تھی۔۔۔۔جہاں ماں کا تخت پوش اینٹوں کے پایوں پر پڑا تھا اس کے نیچے دو دو انچ شور کھڑا تھا۔۔۔۔سارے آنگن میں نوکیلی جھاڑیاں اگ آئی تھیں نہ کہیں اناج تھا نہ پانی۔۔۔۔نارنگیوں کے کٹے ہوئے چاند،سوکھے ہوئے گنوں کا انبار، چاپائیاں گھڑونجی۔۔۔۔چاری کاٹنے والی مشین اماں کی پہاڑی

بکریاں۔۔۔۔ندیدی بلیاں۔۔۔۔چھوٹے چھوٹے لڑکے۔۔۔۔مینھڈیاں کروانے والی تیل میں سنے ماتھے نکالنے لڑکیاں۔

چولہا۔۔۔۔دھواں۔۔۔اماں کے سیپی۔۔۔۔اناج تولنے والا ترازو۔۔۔۔ توشکیں اوران میں نگندے ڈالنے والی عورتیں

وہ سارا کاروبار۔۔۔۔وہ ساری زندگی کہاں گئی؟۔کیا کلر صرف ماں کے جانے کا انتظار کررہا تھا۔

جب میں گلی میں کافی دور نکل گیا تو میں نے پلٹ کر ایک بار پھر حویلی کی طرف نظر کی۔

ابا اوپر ممٹی پر کھڑا تھا۔۔اس کے دونوں بازو آگے کو بٹھے ہوئے تھے۔

راجہ گدھ۔۔۔عمارت کی آخری اونچائی پر مالیخولیا کی لپیٹ میں کھڑا تھا۔

میں نے دل میں سوچا جب بھی روح لاحاصل محبت کرتی ہے یہ دیوانے اپن سے کیوں ہمکنار ہوجاتی ہے؟

کیا روح ہمیشہ لاحاصل راستوں پر جانا پسند کرتی ہے۔

کیا اس کے لیے دیوانگی کے علاوہ اور کوئی پناہ نہیں۔۔۔۔؟کوئی پناہ نہیں؟

سٹیشن کے سامنے یکے پر سے سامان اتارتے ہوئے غریب کوچوان نے شرمساری سے کہا۔۔۔۔''قیوم بھائی آپ بہت دیر بعد گاؤں آئے ہیں۔''

میں نے اسے پہچاننے کے لیے غور سے دیکھا۔

''میں عزیز گاتن کا چاچا ہوں فضل کریم۔''

''عزیز گاتن؟''

''ہاں عزیز گاتن۔''

میں نے فضل کریم کو چھی ڈالی وہ میرے گرمجوشی سے واضح طور پر متاثر ہوگیا۔

غالباً پینٹ سوٹ والے سے اس کا یہ پہلا معانقہ تھا۔

''عزیز گاتن کا کچھ پتہ چلا؟''

''کہاں جی۔۔۔وہ تو پتہ نہیں کہاں غایب ہو گیا اچانک؟''

فضل کریم مجھے سلام کر کے بڑے مؤدب طریقے سے واپس چلا گیا۔ میں پلیٹ فارم پر اکیلا مسافر تھا۔ جب تک گاڑی نہیں آئی میں اپنے اکلوتے سوٹ کیس پر ہاتھ رکھے سوچتا رہا۔

عزیز گاتن، پھجا، ہمبلی ننا، سب کہاں گئے؟۔۔۔گاؤں میں پہنچ کر میں نے اس میں سے کسی کو بھی تو یاد نہیں کیا؟

ہم نے کئی سال اکھٹے مٹیا ٹاپو کھیلا تھا۔۔۔کوئلے سے دیواروں پر لکیریں کھینچی تھیں۔ گاؤں کی ہر چھوٹی بڑی پگڈنڈی اور بڑے چھوٹے درخت پر ساتھ رہے تھے۔

یہ وقت کیا کرتا رہتا ہے

یہ وقت۔۔۔آخر چاہتا کیا ہے؟

عزیز گاتن؟۔۔۔فضل کریم کا بھتیجا۔۔۔عزیز گاتن؟

وہ جھیور تھا۔ گاؤں کے بڑے پیپل تلے اس کی ماں تندور تپایا کرتی تھی۔ سردیوں کے موسم میں سہ پہر کے وقت روٹیاں لگانے سے بہت پہلے جب وہ منجھٹیوں کا بالن جلا کر تندور کو ابتدائی سینک دیتی تو گاؤں کی لڑکیاں لڑکے اس سے دانے بھنوانے آیا کرتے، میں بھی دو چار بھٹوں کے دانے اتار کر چھابے میں ڈالتا اور ماسی الفت کے تندور پر پہنچ جاتا۔

عزیز گاتن سے میری بچپن کی دوستی تھی۔ وہ نا ٹے قد کا چوڑا چوڑا چمکدار لڑکا تھا اس کے سر پہ ہمیشہ استرا پھرا ہوتا۔ جو اکنی دونی اس کی ماں اسے خرچنے کے لیے وہ اپنے کان کے اندر والے کٹاؤ میں پھنسا کر رکھتا۔ اس کی قمیض کو کبھی بٹن نصیب نہ

ہوئے ۔اسی لیے سیاہ گانی والا تعویذ ذرا سا جھکنے پر آگے کو جھولنے لگتا۔وہ ایک پاؤں کا پنجہ اندر کو ڈال کر چلتا تھا۔اسی لیے رات کے وقت اس کی چال میں تھوڑا سا چھلیداپن پیدا ہو جاتا۔

عزیزے گاتن کا اوپر والا ہونٹ پیدائشی کٹا ہوا تھا۔۔۔۔اسی لیے وہ ہمیشہ ہنستا دکھائی دیتا۔لیکن میں تو عزیز گاتن کو بچپن سے جانتا ہوں وہ چھوٹی عمر سے غلیظ باتیں سننے کا عادی ہو گیا تھا۔پرانے بھٹے کے پاس جہاں مائی توبہ توبہ کی جھونپڑی تھی۔۔۔ ۔وہاں مجھے اور ہمبلی کو لے جا کر وہ ایسی ایسی گالیاں سکھاتا کہ ان کے معنی نہ سمجھتے ہوئے بھی ہم دونوں کے کان جلنے لگتے۔

شاید عزیز گاتن ہنستا نہیں تھا بچپن سے اسے اپنی ماں کے متعلق باتیں سننی پڑی تھیں۔جب کبھی اس کی ماں کے متعلق گفتگو ہوتی۔لوگ اچانک ہی بہت بے پروا ہنسوڑ، ننگے اور جنسی ہو جاتے کسی کو خیال بھی نہ رہتا کہ عزیز گاتن سن رہا ہے وہ چونکیل جانور کی طرح ادھر ادھر دیکھتا رہتا۔ایسے میں اس کے کان میں پھنسی ہوئی اکنی چونی بہت چمکنے لگتی۔۔۔۔۔پہلے وہ نظروں سے بھاگ جانے کی راہ تلاش کرتا لیکن راہ نہ پا کر کھڑا رہتا۔۔۔۔یوں لگتا جیسے وہ ہنس رہا ہے سب کے ساتھ۔۔۔۔اپنی ماں پر۔۔۔۔ماسی الفت کی ننگی حرکتوں پر۔

شاید اس کی پیدائشی بے بسی تھی جو ہنستی رہتی تھی۔شاید اوپر والا کٹا ہوا ہونٹ اسے مصنوعی ہنسی ہنسنے میں مدد دیتا تھا۔!

ماسی الفت موہنجداڑو کے زمانے کی پتلی تھی۔اس کا رنگ بھٹی میں پکی ہوئی سرخ اینٹ جیسا تھا ہاتھ روٹیاں گھڑنے میں جتنے تیز تھے اتنے ہی چٹائی پر دھرے ہوئے اس کے بھاری کولہے سست تھے۔وہ ہمیشہ چھینٹ کی شلوار اور ململ کا سیاہ کرتا پہنتی تھی شاید بتوں کا اسے بھی خیال نہیں آیا کیونکہ جب کبھی وہ رفیدے پر روٹی ڈال کر تنور کے اندر جھکتی تو گلے سے رسنے والا پسینی اندر جڑے ہوئے پیٹروں پر گرتا

نظر آتا۔ میں نویں جماعت میں تھا۔ جب مجھے احساس ہوا کہ ماسی الفت بڑی شے ہے وہ سر پر بھاری کھیس ڈالے روٹیاں نکالنے والی سیخ پھرتی سے تندوری میں ڈالتی۔ ایسے میں اس کے سست کولہے کئی زاویئے بناتے جب کبھی وہ مجھے چوری چوری اپنی طرف دیکھتا پالیتی تو سادگی سے ہنس دیتی۔ ''لے لو۔۔۔۔ اب تو حویلی والوں کا قیوم بھی جوان ہوگیا۔''

ماسی الفت کی بہت بکری تھی۔۔۔۔ اپنی بھی اور روٹیوں کی بھی اس کے گاہک روٹیوں کی قیمت علیحدہ چکاتے تھے اور اس کے لیے الگ نذرانے لاتے تھے لیکن سنا ہے وہ سارا مال جوڑتی رہتی تھی عزیز گاتن کے لیے۔

لیکن یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب چندراں کے باہر سیم نالہ دور سے نکالا کرتا تھا اور گاؤں کی صرف باہر والی زمینیں سیم سے متاثر ہوئی تھے۔ چندرا سے کچھ دور شور، دلدل اور پھٹے ہوئے کھیت تھے۔ لیکن گاؤں کے ساری طرف لہلہاتے کھیت تھے۔ لیکن گاؤں کے ساری طرف لہلہاتے کھیت تھے۔ جھڑ بیریوں کو بیر لگتے، نیم کی نمکولیوں سے آنگن بھر جاتے تھے اور سیاہ تنے والے کیکروں پر پیلے پیلے پھول اگتے ابھی چندرا میں برسیم کے کھیت اتنے گھنے تھے کہ عزیز گاتن گنا چوستا اس میں جاتا دھوتی کھولتا اور دوبارہ باندھ لیتا کسی کو پتہ بھی نہ چلتا کہ کیا ہوا ہے اور کیوں ہوا ہے۔؟

آج اگر عزیز گاتن چندرا میں ہوتا تو کیا میں اسے سیمی کی محبت کے متعلق کچھ بتا سکتا؟ حالانکہ جب تک میں گاؤں میں رہا۔ ہماری آپس میں کوئی بھید نہ تھا۔ وہ سجراں، بیوں، باکی، جنتے کی محبت کو تو سمجھ سکتا تھا۔۔۔۔ لیکن سیمی کی محبت اسے اب سمجھ نہ آتی شاید میرے حالات سن کر وہ کہتا۔۔۔۔ ''اچھا جب وہ تمہارے ساتھ سو لیتی ہے تو باقی کیا تکلیف ہے اور کیا چاہئے تمہیں۔''

اگر میں اسے گاؤں میں مل بھی لیتا تو اس کو اپنی محبت کے متعلق کچھ سمجھا نہ سکتا ایسی

محبت جو جبلی تقاضوں کی آسودگی کے باوجود آسودہ رہتی ہے جس میں ہر وصل میں ہجر کا مزا ہوت ہے جس میں ہاتھ ضرور پڑ جاتا ہے لیکن ایسے ہی جیسے بس میں آدمی ہینڈل کو پکڑ کر سوار ہو جائے اور اندر نہ گھس سکے۔

دیوانگی کی سرحدوں کو چھونے والی محبت کا کچھا چٹھہ میں عزیز گاتن کو کیسے سمجھا سکتا۔۔۔۔

لیکن چاچا فضل کریم کا عزیز گاتن تھا کہاں

ماسی الفت کی انکھ کا تارا جانے کہاں چھپ گیا تھا؟ گاؤں سے اچانک غائب ہو جانے کی بھی عجیب داستان تھی۔

اس روز عزیز گاتن حویلی میں داخل ہوا تو اس کے کان میں دس پیسے کا سکہ چمک رہا تھا اس نے کھدر کی قمیض پہن رکھی تھی اور قمیض کی جھولی اس طرح اٹھا رکھی تھی کہ چارخانے والی تہمد کے ڈب اور ناف صاف نظر آتی تھی

''اوئے قیوم۔۔۔۔''اس نے حویلی میں داخل ہو کر آواز دی

کئی عورتوں نے کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا ماسی الفت اور عزیز گاتن سارے گاؤں کے لیے تفریح کا باعث تھے۔ پھر اس نے اماں کے تخت پر جھولی کھولی کر کچے پکے پیلو ڈھیر کر دیے ہم دونوں پکے کچے پیلو علیحدہ کرنے میں مصروف تھے کہ چاچا غلام رسول اندر سے نکلا۔

چاچا غلام رسول ابا کا کچھ ہٹاں سار رشتہ دار تھا کیونکہ اماں اس سے کانا پرودہ کرتی تھی جس وقت چاچا انگن میں آتا۔ اماں کی ساری کلب منتشر ہو جاتی۔ لونگ والی چوڑے والیاں، چھاج پھٹکتی، مسالہ پیستی، آٹا گوندھتی، مخلوق میں زلزلہ سا آجاتا، جیسے اچان فائرسن کر چڑیاں اڑ جاتی تھیں۔ ایسے ہی ترنت عورتیں چلنے لگتیں۔ لڑکیاں سروں پر آنچل کر لیتیں اور جوان عورتوں کو اپنی چادریں یاد آجاتیں

چاچا غلام اشتہاری مجرم جیسا اشتہاری عاشق تھا شروع شروع میں پان سات

معاشقے چندرا میں بھی دھڑلے کے ہوئے لیکن دوکان کی مشہوری سے بہت پہلے بات پھیل گئی کہ سارا سودا ناکارہ ہے۔ آنگن میں پہنچ کر عموماً چاچا غلام اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیرتا کان کی میل نکالتا۔ کسی چھوٹے بچے کو شیشہ پکڑا کر مونچھوں کے بال تراشتا۔ جو بھی باورچی خانے میں موجود ہوتی اس سے باسی روٹی اور مکھن مانگ کر کھاتا اور پھر لال نری کی جوتی میں سے لٹھے کی شلوار جیسی شڑاق شڑاق آواز نکالتا، وہ کبھی آنگن میں یہاں جاتا کبھی وہاں۔۔۔۔ چاچا بڑا حکمتی آدمی تھا اسے ہر لڑکی ہر عورت کی پرسنل ہسٹری معلوم تھی۔ کون سیدانی کس میراثی کے ساتھ کتنی دیر پھنسی رہی۔ کونسی شیخانی کا پانچواں بچہ حرامی تھا کس مغلانی نے اپنے مزراع کے بیٹے سے دوستی لگا رکھی ہے کون سی آرائیں گھر سے اودھل گئی تھی۔۔۔۔ ایسے قصے اسے بڑی چٹ پٹی تفصیلوں کے ساتھ یاد تھے۔ ایسی کہانیوں کی وجہ سے جوان لڑکے اس کے پاس بیٹھنا پسند کرتے تھے۔ وہ جوانوں کو محبت کرنے کے طریقے ایسے سکھاتا جیسے پہلوان اپنے پٹھوں کو داؤ پیچ ازبر کراتے ہیں

ابا نے ہمیں چاچا کی صحبت میں بیٹھنے کی سختی سے ممانعت کر رکھی تھی۔ اس کے باوجود جب وہ باتیں کیا کرتا ہم کسی نہ کسی بہانے وہیں منڈلایا کرتے۔۔۔۔ باتیں کرتے کرتے وہ یکدم گھر سے نکل کھڑا ہوتا۔ دراصل جونہی کوئی لڑکی اس کی باتیں سن کر ہنستی ہوئی حویلی سے رخصت ہوتی۔۔۔۔ چاچا غلام کو بھی کوئی بہت ضروری کام یاد آجاتا۔

ابا کو چاچا غلام پسند نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ کئی سال ہمارے گھر رہا چاچا غلام کوئی کام نہیں کرتا تھا، لیکن بیگار لینا خوب جانتا تھا۔ ہم نے اسے کبھی ابا کے ساتھ کھیتوں پر جاتے نہیں دیکھا۔ وہ گھر کے کسی کام میں بھی دلچسپی نہ لیتا، لیکن کوئی ایسی بات ضرور تھی جس کی وجہ سے ابا اس سے بدکتا تھا۔

پتہ نہیں ابا نے چاچا غلام سے کوئی بڑی رقم پکڑی ہوئی تھی

پتہ نہیں ابا کا کوئی گہرا راز چاچا غلام کے پاس تھا
یا شاید وہ دونوں کسی جرم میں شریک رہے تھے؟

ہم چھوٹے تھے ہمیں اصلی وجہ معلوم نہ تھی۔لیکن ہم دیکھتے کہ چاچا کی تھالی میں ہمیشہ بوٹیاں زیادہ ہوتیں۔اسے ملائی مکھن اور پراٹھوں کے علاوہ مکھن میں تلے ہوئے انڈے بھی ناشتے پر ملتے۔اس کی چارپائی پر کڑھے ہوئے تکیے کے غلاف رہتے جب بھی وہ کوئی فرمائش کر دیتا تو پھر اماں اور ابا اسے ضرور پوری کرتے۔ابا چاچا غلام کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن اس کا خیال بہت رکھتا تھا۔

عزیز گاتن اور میں صحب مین اماں کے تخت پوش پر پیلو علیحدہ کر رہے تھے کہ ٹانسے کی دھوتی اور لیس لگا کرتا پہنے چاچا غلام اندر سے نکلا۔چند منٹوں میں آنگن خالی ہو گیا۔صرف باورچی خانے میں دو عورتیں ہماری طرف پشت کیے بیٹھی آٹا گوندھتی رہیں۔۔۔۔

عزیز گاتن اس روز بہت خوش تھا

''دنیا داراں دے گھر دیندا بیٹے ولی الٰہی۔ولیاں دے گھر پیدا کردا میرے وانگ گناہی۔۔۔۔''زور زور سے عزیز یوسف زلیخاں گا رہا تھا کہ پیچھے سے آ کر چاچا غلام نے اس کی گدی میں دھول ماری۔عزیز گاتن کی انکھیں یکدم خوف سے کھلی ہو گئیں۔۔۔۔اماں توبہ سے بھی زیادہ ہم چاچا غلام سے ڈرتے تھے۔

''اوئے تیری ماں کو کچھ عقل ہے کہ نہیں؟۔۔۔۔پلید کہیں کی۔''

عزیز گاتن مسکرانے لگا

جب بھی عزیز گاتن سنجیدہ ہو جاتا، ایسے لگتا کہ مسکرا رہا ہے کیونکہ اس کے اوپر والے ہونٹ میں پیدائشی شگاف تھا اور منہ سختی سے بند کرنے کی صورت میں وہ مسکراتا ہوا نظر آتا۔

عزیز گاتن اپنی ماں کے متعلق بہت سے باتیں سننے کا عادی تھا ماسی کو بیوہ ہوئے

چھ سال ہوئے تھے۔وہ بالکل آزاد تھی اور اسے اپنی آزادی بڑی پیاری تھی۔عزیز گاتن تو باتیں سن کر مسکرانے لگتا۔لیکن میرے ہاتھوں میں پسینہ آجاتا۔

''اوئے بول تیری ماں ہے ناں اجڈ گنوارنا پاک''

گاتن چپ چاپ سنتا رہا۔

''سن رہا ہے میری بات بل پھٹیا؟۔''

''جی۔''

پتہ نہیں کیوں میرا دل رونے کو چاہ رہا تھا۔

''حرامی! اپنی فیشن کی ماری ہوئی ماں کو کہنا، پہلے جسم کی صفائی سیکھے۔۔۔۔بتانا اسے جسم کے بال ناپاک ہوتے ہیں اسے میرا یقین نہ آئے تو جا کر ملا جی سے پوچھ لے مجسں میں۔۔۔۔ویسے تو اسے بڑے مسئلے آتے ہیں جسم کے بالوں کا مسئلہ نہیں اتا کو ڈوکو۔۔۔۔؟''

''اچھا جی کہہ دوں گا۔''

عزیز نے ہاتھ میں چنے ہوئے پیلو تخت پوش پر رکھ دیے۔اس سے پہلے کئی بار میں نے اسے لوگوں کے ہاتھوں ذلیل ہوتے دیکھا تھا لوگ اس کے منہ پر اس کی ماں کو گالیاں دیتے،لیکن وہ کبھی چپ نہ ہوا تھا۔

پہلی بار بل پھٹیا کے چہرے پر مسکراہٹ نہ تھی۔

چاچا غلام نے مٹھی بھر کے پکے پکے پیلو اٹھائے اور باورچی خانے کے ڈھارے کی جانب مڑ گیا۔گاتن نے کچھ نہ کہا گلے کے تعویذ کو قمیض کے اندر کیا اور باہر چلا گیا۔میرا خیال تھا کہ کچھ عرصے بعد وہ خود ہی لوٹ آئے گا لیکن اس روز کے بعد اسے کسی نے گاؤں میں نہیں دیکھا۔۔۔۔کچھ دن ماسی الفت نے اس کی تلاش کی پھر ایک دن اس کی ماں نے گلہ اپنے گاہکوں کو دھنوس دے دے کر جمع کیا تھا تندور کے دہانے پر مار کر توڑا اور بڑ کے کے درخت تلے سارے روپے اٹھنیاں چونیاں

دس پیسے نوٹ یوں پھینکے جیسے عزیز گاتن کی برات پر سے سوٹ کر رہی ہو۔وہ پیسے پھینکتی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی ۔۔۔۔"اٹھالو کتو۔۔۔۔اٹھالو۔۔۔۔میں نے عزیز گاتن پر وارے اٹھالو،،،،،"

اس شام میں پرانے بھٹے پر ہمبلی کے ساتھ غلیل لے کر شکار کے لیے گیا ہوا تھا جب شام پڑنے لگی اور ہم نے گھر لوٹنے کا ارادہ کیا تو میں نے دیکھا کہ چندرا کی طرف سے ایک بڑا سا گدھ بھاگتا ہوا آیا اور سیم نالے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا اس گدھ نے خاکی رنگ کے کھیس کی بکل مار رکھی تھی اور پیروں میں کچھ نہ تھا۔

پھر راجہ گدھ سیم نالے کے ساتھ گرتا پڑتا چلنے لگا۔کبھی کبھی اس کے دونوں بازو آپی آپ آسمان کی طرف اٹھ جاتے اور پھر بغیر ٹھوکر کھائے گر جاتا۔۔۔۔کچھ فاصلے تک میری نگاہوں نے اس راجہ گدھ کا تعقب کیا اس کے بعد ماسی الفت ہمیشہ کے لیے افق میں کھوگئی۔

اچانک ماسی الفت اور عزیز گاتن کے غایب ہونے پر اور تو کچھ نہ ہوا،صرف چندرا گاؤں کے باہر پھیلنے والا کلر گاؤں کے اندر بڑھنے لگا ہر آندگی کے ساتھ ہر بارش کے ساتھ۔۔۔ہر موسم میں اس رفتار تیز تر ہونے لگی۔اونچے اونچے درخت ٹنڈ منڈ ہوئے۔۔۔کھیتوں میں لہلہاتے سبزے کی جگہ دلدل،شور اور نمکین پانی کے جوہڑ بلنے لگے۔کنوئیں کھاری ہوگئے۔ہتھی والے نلکوں کی نالوں پر قلمی شورا چڑھ گیا۔گھروں کی دیواروں سے کلر جھڑنے لگا۔۔۔۔فرش پھول گئے۔چاگاٹیں ڈھیلی ہوگئیں۔زنجیروں پر تنگ جھڑنے لگا۔اور آدمیوں کے چہرے پرانے سکے جیسے گھسے ہوئے نظر آنے لگے۔

اب رفتہ رفتہ لوگ گاؤں چھوڑ کر جانے لگے۔۔۔۔گھروں کے چولہے سرد پڑ گئے اور راستوں کی پھولی ہوئی مٹی پر جانور،چھکڑے،ریڈھے تانگے سامان سے لد لد کر جانے لگے۔اب پیلو کا بور جھڑ جاتا۔کیکر کے درختوں میں زرد پھول نہ آگتے۔

جب میں ماموں کے پاس قصور گیا ہوں۔اس سے کچھ پہلے سارے گاؤں میں کلر نے دھاوا بول دیا تھا۔

ٹرین آئی میں سوار ہو گیا چندرا کے پاس سے پرانے بھٹے کے عقب میں مائی توبہ توبہ کی جھگی سے لے کر اندر تک کلر کا سیلاب تھا۔ساری زمین انڈے کی سفیدی جیسی پھینٹی ہوئی تھی جس وقت چندرا کی حد ختم ہوئی میں نے دیکھا دو اونچے درختوں پر کئی گدھ بیٹھے تھے، نیچے سیم نالے کے پاس ایک بھینس کا ڈھانچہ پڑا تھا۔

شام اتر رہی تھی۔ہوا میں میں نمک تھا

پتہ نہیں مجھے کیوں لگا جیسے ایک درخت سے تیزی کے ساتھ ایک گدھ اترا اور ٹرین کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔اس گدھ کو غور سے دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔لیکن وہ گا رہا تھا۔بھاگ رہا تھا۔ٹرین کی آواز کے ساتھ آواز ملا کر بہر اونچے اونچے

صبح گیارہ بجے میری آنکھ کھلی تو ابھی تک میں چندراں میں تھا۔

دانت صاف کرتے ہوئے مجھے خیال آنے لگا کہ کسی نوکری پر لگنے سے پہلے مجھے ایک بات پھر چندراں جانا چاہیے شاید اماں کی قبر کسی نے پکی کروادی ہو۔شاید کلر کی وجہ سے قبر پھٹ گئی ہو اور اماں کا ڈھانچہ چاندنی راتوں میں ڈراؤنا لگتا ہو۔پتہ نہیں بھائی مختار چندرا جانے پر کبھی رضامند کیوں نہ ہوتے تھے۔۔۔میں ابھی دل میں یہ پروگرام بنا ہی رہا تھا کہ کسی نے غسل خانے پر دستک دی عام طور پر اوپر آنے کا رواج کم تھا

''قیوم''۔۔۔۔بھابھی صولت نے آواز آئی۔

میں نے دروزہ کھول کر باہر جھانکا

''کہیں جا رہے ہو؟۔''

''جی ریڈیو سٹیشن جاؤں گا۔''

''اچھا؟۔۔۔۔۔'' وہ پوچھنا چاہتی تھیں کہ مجھے وہاں کیا کام ہے لیکن میری ان کی بے تکلفی نہ تھی۔

''جی۔۔۔وہاں مجھے آج ایک سکرپٹ دینا ہے۔''

''سکرپٹ؟''

ریڈیو سٹیشن میں ان دنوں میرا ایک دوست پروڈیوسر لگا ہوا تھا۔۔۔۔وہ بچوں کا پروگرام پرڈیوس کرتا تھا۔وہ مجھ سے عموماً معلوماتی سکرپٹ لکھوالیتا۔

''ایک کہانی لکھی ہے بھابھی ٹیپو سلطان پر۔''

''اچھا۔۔۔۔یہ میری ڈرائی کلینز کی چٹ ہے چار دوپٹے رنگنے کے لیے دیئے ہوئے ہیں بانو بازار میں وہ لے آیو گے نا۔''

''لے آؤں گا۔۔۔۔جی۔''

انہوں نے دس روپے کا نوٹ ڈرائی کلینز کی رسید کے ساتھ میز پر رکھ دیا۔

''نوکری کا کچھ پتہ چلا؟''

''ابھی انٹرویو کے لیے طلب نہیں کیا۔''

''اچھا۔۔۔۔'' دوپٹے کھول کر دیکھ لینا کہیں ڈب وغیرہ نہ ہوں۔''

بھابھی صولت جس لاتعلقی سے آئی تھی ویسے ہی چلی گئیں۔ان کا میرا بھابھی دیور کا رشتہ نہ تھا۔چور سپاہی کی طرح ہم دونوں ایک دوسرے سے بھاگتے تھے۔

جونہی سیمی سے اچانک کنارہ کشی ہوئی تھی۔میں کبھی کبھی ریڈیو سٹیشن سعید کے پاس جا بیٹھتا۔اس کے کمرے میں بڑی رونق ہوتی۔افسر، ڈرامہ آرٹسٹ، مراثی، طوائفیں اناؤنسر اتے جاتے رہتے۔چھوٹے موٹے اخراجات پورے کرنے کے لیے یہ بہترین جگہ تھی۔سعید مجھ سے کبھی کبھی کوئی فیچر کوئی اناؤنسمنٹ کوئی کہانی لکھوا لیتا۔۔۔۔بھابھی یا بھائی کے آگے ہاتھ پھیلانے سے یہ بہتر طریقہ تھا۔کیونکہ فی

الحال میں ذہنی خواری سے ملتا۔ منت سماجت بھی کرنی پڑتی، لیکن میری آزادی میں کوئی خلل واقع نہ ہوتا۔

بھابھی کے دس روپے اور چٹ اٹھا کر میں پیدل کرشن نگر تک پہنچا۔ وہاں سے میں نے سکرٹریٹ تک بس لی۔ چونکہ یہ بس مال پر نہ جاتی تھی اس لیے یہاں سے میں ریڈیو سٹیشن پیدل پہنچنے کا عزم کر کے مال پر چلنے لگا۔ بڑی دیر بعد مجھے پیدل چلنے میں عجیب قسم کی راحت محسوس ہوئی۔ چلنے کی مکینکل انرجی نے خیالات کی چھان پھٹک میں واضح طور پر مدد دی بڑے دنوں بعد مجھے اپنا وجود ایک نارمل صحت مند شہری کا لگا اس وقت میرا سایہ میرے بھائی مختار کے خود اعتماد سائے سے مشابہہ تھا۔ سیمی کا عشق ضرور اپنی جگہ تھا لیکن ذمہ دار شہری کی طرح ان جذباتی مسائل کو سلجھانا میرے بس کی بات تھی۔ اس وقت مجھے کئی پلان سوجھے جس وقت میں جی پی او کے سامنے سے گزر رہا تھا تو چوک بتی کے سامنے انتظار کرتے ہوئے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے مقابلے کے امتحان میں داخلہ لینا ہوگا۔ اس وقت یہ امتحان مجھے بہت آسان نظر آیا۔ اپنے وہ دو پروفیسر یاد آ گئے جو بالکل نالائق تھے اور اس امتحان کو پاس کرنے کی وجہ سے آج کل اسلام آباد کے فیڈرل سکرٹریٹ میں بہت بڑے سفید کالر عہدوں پر متعین تھے ریگل کے چوک تک پہنچتے پہنچتے میں بہت جاہ طلب ہو چکا تھا میری سوچ یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ میں سویڈن ہالینڈ یا سپین میں آپنے آپ کو ایمبیسی میں فسٹ سیکرٹری کے عہدے پر فائز دیکھ سکتا تھ۔ میری ڈاک پاکستان ایمبسی کے تھیلے میں آ جا رہی تھی اور میں جینوا پیرس فرینک فرٹ سٹاک ہوم سے پکچر پوسٹ کارڈ خرید خرید کر وطن بھیجنے میں مشغول تھا جس وقت میں واپڈا کی بلڈنگ کے پہلے سے نکل کر فلیٹی ہوٹل والی سڑک پر نکلا کار میں بیٹھی ہر خوبصورت لڑکی مجھے اپنی بیوی نظر آئی اور بڑی کار پر اپنی ہونے کا شبہ ہونے لگا۔

ریڈیو سٹیشن سے پہلے چوک میں پہنچتے پہنچتے میں اپنے آپ کو جسمانی، ذہنی،

جذباتی طور پر صحت مند سمجھ رہا تھا اس وقت مجھے شبہ بھی نہ تھا کہ راجہ گدھ کی جاتی سے کوئی بھی زیادی وقفے تک صحت مند نہیں رہ سکتا۔ پاگل پن اس پر Quantums میں بڑھتا رہتا ہے جب بھی وہ اپنے نیوکلس کے قریب ہوتا ہے اسے شبہ بھی نہیں گزرتا کہ غیر صحت مند عناصر اس پر اثر انداز ہو سکتے ہیں ذرا سا وہ نیوکلس سے ہٹتا ہے اور وہی سراسیمگی وہی دیوانگی ہی دشت نوردی صحرا پیمائی جو اس کے اندرونی سفر کا حصہ ہے اس پر غالب آجاتی ہے

ریڈیو سٹیشن پہنچ کر حسب معمول میں سعید کے دفتر میں چلا گیا۔ وہ کچھ فلمی گیتوں کی ڈسکیں اٹھائے کھڑا تھا اور اس کے سامنے کرسی پر سیمی بیٹھی تھی۔۔۔ سیمی کے ساتھ والی کرسی پر حیدر تھا اور ان کے ساتھ پروفیسر سہیل چائے پینے میں مشغول تھے

''آؤ سر جی آؤ۔۔۔ آؤ آؤ۔۔۔ سعید نے پرتپاک لہجے میں کہا۔''

میں ہلکے سے اشارے سے سیمی کو سلام کیا

''آج تمہری کہانی یہ پرھیں گی۔۔ سکرپٹ لکھ لائے ہو۔۔۔ پہلے مباحثہ ہوگا، پروفیسر سہیل اور حیدر صاحب کے درمیان پھر۔۔۔''

''ہاں۔''

''انہیں دے دو۔۔۔ ذرا ایک نظر اس پر ڈال لیں۔''

میں نے کہانی سیمی کے سپرد کر دی۔ اس نے اپنے چہرے سے گلابی چشمہ اتارا۔ پھر کرسی کی پشت سے لٹکے ہوئے تھیلے میں سے پڑھنے کی عینک نکالی اور کہانی پڑھنے لگی۔

وہ پہلے سے بہت زیادہ دبلی ہو گئی تھی۔۔۔ اس کی آنکھوں تلے گہرے سیاہ حلقے تھے اور ہونٹوں کا رنگ کاسنی نظر آتا تھا۔ ہاتھوں کی نسیں بہت ابھری ہوئی تھیں اور کہانی کا سکرپٹ پکڑتے وقت اس کا ہاتھ تھوڑا سا لرزا تھا۔

پتہ نہیں میری خوچ اعتمادی ساری کی ساری کہاں گئی۔

''میں ذرا سٹوڈیو کا چکر لگا آؤں۔۔۔۔۔'' سعید یہ کہہ کر باہر چلا گیا۔۔۔۔اور پروفیسر سہیل لاتعلقی سے چائے پیتے رہے انہوں نے مجھ سے کوئی بات ہی نہ کی، جس وقت میں گھر پہنچا تو وہ پہلے سے میرے کمرے میں موجود تھی۔اس نے بال دھو رکھے تھے اور پانی کی ننھی بوندیں اس کالی شال پر چمک رہی تھیں۔

'یہ وقت ہے گھر آنے کا۔'

میں نے ہنس کر کہا۔۔۔۔'یہ وقت ہے سر دھونے کا اور وہ بھی سردیوں میں۔'

وہ ایک ہی جملے سے سیدھی ہو گئی۔

کہاں رہے ہو سارا دن؟'

'پہلے ریڈیو سٹیشن گیا تھا۔وہاں سے پروفیسر سہیل کے پاس چلا گیا۔'

'یہ مرجانا سہیل کون ہے اب؟'

'ہے ایک پڑھا لکھا آدمی۔۔۔۔بے حد۔۔۔۔پاکستان میں اس جیسا دوسرا کوئی نہیں۔'

'پڑھا لکھا ہی ہے نرا کہ آدمی بھی ہے؟'

میں اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں میں مشغول ہو گیا اور وہ چپ چاپ مونگ پھلیاں کھانے میں جت گئی۔اچانک مجھے الماری میں ایک موم بتی نظر آ گئی۔ میں نے اس کاسنی رنگ کی موم بتی کو روشن کیا۔اس کے سامنے کاسی رن کا گڈی کاغذ کتابوں کی مدد سے کھڑا کیا اور بجلی کا بٹن بند کر دیا۔

'ہائے یہ کیا اندھیرا کر دیا قیومی؟'

'دیکھو یہ کاسنی روشنی کتنی پیاری ہے عابدہ۔ اسی روشنی میں چائے پئیں گے۔'

اب وہ اپنے اور وحید کے بے مزہ واقعات بیان کرنے لگی۔

ایک روز وحید نے کیا کیا' ایک بیڈ اور لیمپ خرید کر لایا۔ کسی فلم میں دیکھا تھا اس نے کہ ہیرو بیڈ لیمپ جلا کر پڑھتا ہے۔ گھر آ کر اس نے ساری شام بیڈ لیمپ

فٹ کرنے میں لگ دی۔ تین سوئچ بدلے۔ دو بلب فیوز کیے۔ جب بیڈ لیمپ فٹ ہوگئی تو اس کی روشنی میں بیٹھ کر حساب کتاب دیکھنے لگا..... بد بخت کا چھوٹا سا چہرہ ہے اوپر سے..... رکھی ہوئی ہیں لمبی لمبی راجپوتی مونچھیں..... تو بہ بیڈ لیمپ کے سامنے تو پورا پورا لدھر لگتا تھا بیٹھا ہوا۔"

آج میں سیمی کے متعلق باتیں نہیں کرنا چاہتا تھا' لیکن میں نے صرف مدافعت کے طور پر کہا..... جب آفتاب لندن چلا گیا عابدہ تو سیمی پر حسد کا دورہ پڑ گیا۔ وہ سارا سارا دن ایسے خیالوں سے اپنے آپ کو لہولہان کرتی رہتی تھی جو آفتاب اور زیبا سے متعلق ہوتے..... آدمی کتنا اذیت پسند ہے۔"

جب آفتاب نے شادی ہی کر لی تھی تو پھر سیمی کو تم سے شادی کر لینی چاہیے تھی۔ میں خلاف ہوں ایسی باتوں کے۔"

"وہ شادی نہیں محبت کی آرزومند تھی۔"

"ہائے شادی کا محبت سے کیا تعلق..... کسی نکاح نامے پر کبھی تم نے دیکھا ہے محبت کا خانہ معجّل اور غیر معجّل کا تو ہوا ناں خانہ۔"

" اگر شادی لائسنس بناتا تو تین قسم کے نکاح نامے ہوتے۔ سفید نکاح نامے ان لوگوں کے لیے جو دن رات ایک دوسرے کے قرب کی آرزو رکھتے ہیں۔ گلابی کارڈ دنیاوی وجوہات والوں کے لیے مثلاً تنہائی سے بچنے کے لیے ماں باپ کی ناک بچانے کے لیے..... وغیرہ وغیرہ اور سبز کارڈ صرف ان کو دیا جاتا جو افزائش نسل کے لیے لائسنس چاہتے ہیں۔ صرف سبز کارڈ مستقل ہوتا' باقی سب کارڈ سال دو سال کے بعد renew کرانے پڑتے"۔

"لائسنس سب سفید رنگ کا بنواتے اور بچے سب کے ہو جاتے پھر..... فٹے منہ ایسی سوچ پر۔" وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

میں شرمندہ سا ہو گیا۔ کاسنی گڈی کاغذ موم بتی کر طرف جھک کر ہلکا سا جھلس گیا

تھا۔لیکن کمرے کی روشنی اس وقت بڑی دل فریب تھی۔میرا دماغ خود بخود سہیل کی باتوں سے گونجنے لگا۔

''بھائی صاحب محبت نہیں ملتی کہیں بھی چاہیے سفید کارڈ بنواؤ چاہیے گلابی..... دنیا میں تو گزارہ ہی کرنا پڑتا ہے اور گزارے کے لیے شادی اچھی ہے۔'' اس نے مجھے مشورہ دیا۔

میں نے چائے کی پیالی اس کے ہاتھ سے لی اور قریباً اپنے آپ سے بولا۔

''تمہیں کیا پتہ عابدہ..... شکر کرو شکر، تم سوچتی نہیں ہو۔وجوہات تلاش نہیں کرتی ہو۔ معنی کی جستجو..... نہیں کرتی ہو ورنہ تمہیں بھی سورج کے اردگرد کئی غلاف نظر آنے تھے۔''

''اب کیا سوچ رہے ہو..... موم بتی بجھادوں کہیں آگ نہ لگ جائے۔''

''لگ جانے دو آگ۔''

ایسے جملوں کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا وہ کند چھری سے حلال ہونے والی نہ تھی۔

''میں نے تو محبت کے متعلق کبھی زیادہ نہیں سوچا۔'' عابد بولی۔

''اور میں اس کے علاوہ اور کسی چیز کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا۔''

''پھر کیا سوچا ہے تم نے آج تک؟''

''یہی کہ دولت اور محبت کی ایک سی سرشت ہے۔ دولت کبھی ان جانے میں چھپر پھاڑ کر ملتی ہے۔ کبھی وراثت کا روپ دھار کر ایسے ڈھب سے ملتی ہے کہ چھوٹی انگلی تک ہلائی نہیں ہوتی اور آدمی مالا مال ہو جاتا ہے۔ پھر اکلوتے لاڈلے کی طرح دولت کو اجاڑنے برباد کرنے میں مزہ ملتا ہے۔کبھی پائی پائی جوڑتے رہنے پر بھی پورا روپیہ نہیں ہوتا۔ کبھی محبت اور دولت ملتی رہتی ہے لیکن سیری کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ چادر پوری نہیں ہوتی تن پر..... کبھی محبت رشوت کے روپے کی طرح ڈھکی چھپی ملتی ہے لوگوں کو پتہ چل جائے تو بڑی تھڑی ہوتی ہے۔ کبھی

کاسے میں پڑنے والی اکنی دونی کی خاطر ساری عمر تیرا بھلا ہو کہنا پڑتا ہے۔ تجھے کیا پتہ عابدہ محبت اور دولت نے انسانی دل پر کیا کیا حکمرانی کی ہے۔ چاہتے تو سیلاب کی طرح بستی اجڑ جائے' ان کے ہاتھوں چاہتے تو بوند بھر ہ برسے اور ریگستان کے اوپر سے گرجتی چمکتی چلی جائے ..... ان سگی بہنوں سے تو جس قدر ناطہ کم ہو آرام ہے۔"

کاسنی کاغذ جھلس کر کالا ہو چکا ہے۔ عابدہ اٹھی اور سانس کی لمبی پھونک سے اس نے موم بتی بجھا دی۔ از سر نو بجلی کا بلب جلنے لگا۔

"قیوم تمہیں کسی دماغی ڈاکٹر سے ملنا چاہیے۔"

"کیوں؟"

"مجھے یوں لگتا ہے تمہارے سر کو گرمی ہو گئی ..... ہے۔"

"تمہارے پاس اس کا کوئی علاج نہیں۔"

"میری اماں ایک پھنکی بنایا کرتی تھیں۔ بادام کی گریاں چار مغز' سونٹ۔ چھوٹی الائچی مصری....."

"تم کچھ نہیں بنا سکتیں۔؟"

"میں کیا کر سکتی ہوں ..... مجھے وہ نسخہ ہی نہیں آتا۔"

"میرے ایک دوست نے بتایا ہے کہ تم شکتی ہو..... تم مجھ نربل کو طاقت دے سکتی ہو۔"

"کیسے؟"

اس وقت تک مجھے علم نہ تھا کہ میں سہیل کی باتوں کو عابدہ سے دوہراؤں گا۔ مجھے تو یہ بھی علم نہ تھا کہ عابدہ اور مجھ میں کوئی رابطہ ممکن بھی ہے؟

"مرد اور عورت کے درمیان آٹھ قسم کا لگاؤ ہوتا ہے اور ہر لگاؤ سے انسان کو ایک خاص قسم کی شکتی ملتی ہے۔"

وہ حیرانی سے میرا منہ تکنے لگی۔

''پہلا تعلق خیال کا ہے..... جب کسی کا خیال دماغ میں بس جاتا ہے اور نکالے نہیں نکلتا تو اسے سمرنا نام کہتے ہیں۔ جب اس تعلق کا ذکر کسی سے کریں تو یہ دوسری سٹیج ہے۔ جنس لطیف کی صحبت میں رہنا تیسرا تعلق ہے۔ عورتوں کے ساتھ ہنسی دل لگی چوتھا..... عورت سے دلی گفتگو کرنا پانچویں سٹیج ہے۔ اس کے بعد جسمانی تعلق کی آرزو چھٹی حالت ہے۔ اس آرزو کو ارادے سے پختہ کرنا ساتواں تعلق ہے اور آخری اور مکمل سیڑھی وہ ہے۔ جب شوجی اور شکتی ملتیک ہیں اور ایسی روح کو جنم دیتے ہیں جو نہ مرد ہوتی ہے نہ عورت۔''

'' ہائے ہائے کہیں باتیں کرنا بھی گناہ ہی نہ ہو.....'' وہ کرسی سے اٹھی۔ چھلکے مونگ پھلی کا لفافہ ایک چھناکے سے فرش پر گرا' میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی چادر پکڑی اور بولا..... ''بیٹھ جاؤ'' ..... آرام سے مرد اور عورت جب سچے دل سے پریم بھگتی کرتے ہیں۔ تو پھر وہ گناہ نہیں کرتے بلکہ اپنی کنڈالنی کو آزاد کراتے ہیں۔''

''وہ بد بخت کیا چیز ہے؟''

عابدہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔

''انسان کے جسم کا ایک حصہ نظر آتا ہے اور دوسرا حصہ نگاہوں سے اوجھل ہے ہمارے غدودی نظام کے ساتھ ساتھ طاقت کا ایک اور وجود بھی چلتا ہے' یہ وہ سرچشمہ طاقت ہے جو آدمی کی orative evergy کہلاتا ہے۔''

''یہ ساری باتیں تم کتابوں سے سیکھتے ہو؟''

'' کچھ کتابوں سے کچھ تبادلہ خیالات سے۔''

''بند کرو ان دونوں کو۔''

''کیوں۔؟''

''لادین ہو جاؤ گے دیوانے ہو جاؤ گے سچی۔''

وہ میرے سامنے لب سکیڑ کر بیٹھی تھیا ایسے لگتا تھا جیسے وہ ابھی رونے لگے گی' ہم دونوں تھوڑی دیر خاموش رہے پھر وہ بولی..... یہ کنڈالنی چنڈالنی کون ہے؟''

'' واقعی یہ کنڈالنی ہی چنڈالنی ہے..... یہ وہ سانپ ہے جو ہمارے مقعد اور عضو تناسل کے درمیان استراحت کرتا ہے۔''

''ہائے میں مری۔''

'دیہی کنڈالنی کی قوت آہستہ آہستہ اوپر کو سر اٹھانے لگتی ہے پھر ایک چکر تک پہنچتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اوپر اٹھتی جاتی ہے۔ حتی کہ ہمارے سر تک پھن اٹھا کر جا پہنچتی ہے اس کو کنڈالنی کے سفر میں انسانی کی بقا یا فنا ہے..... وہ کس سطح تک پہنچتا ہے اور کیوں پہنچتا ہے۔ یہ سب ارتقا کنڈالنی کی وجہ سے ہے۔''

'' یہ..... چکر کیا ہے؟..... تمہیں آج کیا ہو گیا ہے.....'' وہ محجوب سی ہو کر میرے پاس بیٹھ گئی۔

''پہلا چکر مقعد اور آلات تناسل کے درمیان ہے۔ اسے مولا دھارا کہتے ہیں۔ اس کی چار سرخ پتیاں ہیں۔ اس کے درمیان میں ایک مربع زمین کی علامت ہے۔ اس مربع کے اندر ایک تکون ہے جس میں تمام psyclie energy بند ہے جسے کنڈالنی کہتے ہیں۔ اس کنڈالنی نے سانپ کی مانند ریڑھ کی بنیاد پر چکر بنا رکھا اور اس کنول جیسے چکر میں چمکتی ہے' بتیوں کی طرح روشن ہے جو شخص اس جگہ پر دھیان لگاتا ہے وہ آرزو' حسد' غصہ پر قابو پا سکتا ہے۔''

تجھے تو کچھ ہو گیا ہے قیومی خدا قسم۔''

'' اور کچھ نہیں تو بات ہی سن لو عابدہ۔'' میں نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ دراصل مجھے سہیل نے اس قدر پمپ کر دیا تھا کہ میں ساری گیس کسی اور ذی روح پر نکالنا چاہتا تھا۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا عابدہ میری باتیں سننے کی عادی نہیں۔ اگر وہ سن بھی لے تو ان کا ادراک اس سے ممکن نہیں پھر بھی بولتا گیا۔